Lesson 2: Yusuf (Ayaat 19- 35): Day 6

سُوۡرَةُ یُوسُف کی تفسیر

آج کے سبق میں ہم عروج وزوال کی کہانیاں دیکھیں گے۔ دوسری بات یہ دیکھیں گے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کیسے شَر میں سے خیر نکالتا ہے۔ کس طرح حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے اُنہیں مارنے کی تدبیر کی اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کس طرح اُنہیں اس میں سے نکالا۔

اگلی بات ہم یہ دیکھیں گے کہ جب عورتیں اپنے حُسن کی نمائش کرتی ہیں تو مردوں کے لیے کتنا فتنہ بنتا ہے۔ اگلی بات کہ جب حالات خراب ہوں اور اِرد گرد پُر کشش چیزیں ہوں تو نوجوانوں کو اپنی عزت کیسے بچانی چاہیئے۔ اور ہم یہ دیکھیں گے کہ آج کے فتنوں میں جو بہت بڑا فتنہ بے حیائی اور بدکاری کا فتنہ ہے اُسکا کیا علاج ہے۔

کہانی وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے رُکی تھی۔ حضرت یوسفؑ بھائیوں کے حسد کا شکار ہوئے، باپ کی محبت بھری گود سے نکل کر کنوئیں کے اندر آگئے لیکن وہ خوشیوں بھرا وقت تھا یہ تکلیفوں بھرا وقت ہے لیکن دونوں حالتوں میں یوسفؑ کے دل کی حالت نہیں بدلی۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ فرشتے کو بھیج کر تسلیاں دلا رہے تھے کہ غم نہ کرو ایک وقت آئے گا کہ تم بھائیوں کی اس غلط کام کو اُن کے سامنے پیش کرو گے۔ اور اس وقت بھی یوسفؑ اللہ کے فیصلوں پہ راضی دِکھتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کی عمر کے بارے میں لوگ بہت تجسس رکھتے ہیں تو اُن کی عمر نہ تو اتنی کم تھی کہ کچھ سمجھ نہ سکتے اور نہ اتنے بڑے تھے کہ بھائیوں سے خود کو تر نوالہ بنانے سے بچالیتے۔ بالکل ایک الھڑ سی عمر کا معصوم، بھولا سا بچہ ذہن میں آتا ہے۔ ہر دور کے بچوں کی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ آج کا سات سال کا بچہ اتنا چالاک ہو سکتا ہے جتنا ہو سکتا ہے حضرت یوسفؑ کے دور میں تیرہ سال کا بچہ بھی نہ ہو۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

ادھر ایک قافلہ آیا اور اُس نے اپنے سقے کو پانی لانے کے لیے بھیجا سقے نے جو کنویں میں ڈول ڈالا تو (یوسفؑ کو دیکھ کر) پکار اٹھا "مبارک ہو، یہاں تو ایک لڑکا ہے" ان لوگوں نے اس کو مال تجارت سمجھ کر چھپالیا، حالانکہ جو کچھ وہ کر رہے تھے خدا اس سے باخبر تھا۔

جس کنوئیں میں یوسفؑ کو ڈالا گیا وہ شام سے مصر کے راستے میں تھا۔ مصر اُس وقت کا ایک ایڈوانس مُلک تھا۔ ان کے پاس بہت دولت بھی تھی اور لوگوں پر اُنکا بہت رعب بھی تھا۔ تو اُس دور میں لوگ قافلوں کی صورت میں سفر کرتے۔ جب کوئی قافلہ سفر پہ نکلتا تو پہلے آگے سقّے یا ملازم کو بھیجتے کہ جا کے پڑاؤ کا انتظام کرے۔ لفظ سَیَّارَۃ کا معنی ہے چلنے والا۔ یہاں اس سے مُراد قافلہ ہے۔ بھائیوں کا خیال تھا کہ کوئی آتا جاتا اس کو اُٹھا کے لے جائے گا۔ وَارِدَ کہتے ہیں پانی لینے والے کو۔ تو جب انہوں نے ملازم کو پانی لینے بھیجا اور اُس نے اپنا ڈول کنوئیں میں ڈالا۔ فَاَدْلٰى ڈول ڈالنے کو کہتے ہیں۔ تو جب اُنہوں نے ڈول ڈالا تو اندر سے یوسفؑ نکل آئے۔ جب اُس سقّے نے آپ کو دیکھا تو بے اختیا خوشی سے منہ سے نکلا يٰبُشْرٰى۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے میں انسان بکا کرتے تھے۔ اور جو جتنا خوبصورت ہوتا تھا، لوگ اُسے اُتنی بھاری قیمت پر خریدتے تھے۔ بِضَاعَةً بنیادی طور پر ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ یہاں مالِ تجارت مُراد ہے۔ یعنی اُنہوں نے یوسفؑ کو تجارت کا مال سمجھ کے چھُپا دیا کہ بعد میں اسے بیچ دیں گے۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

آخر کار انہوں نے اس کو تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض بیچ ڈالا اور وہ اس کی قیمت کے معاملہ میں کچھ زیادہ کے امیدوار نہ تھے ۔

انسان چوری کے مال سے جان چھڑُانا چاہتا ہے۔ اس لیے یوسفؑ کو چند ٹکوں پہ بیچ دیا کہ کہیں یہ بھی نہ ہاتھ سے نکل جائے یہ ایسے ہی ہے کہ چوری کے مال کو لوگ اونے پونے دام بیچ دیتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ اُنہیں یوسفؑ کے بارے میں کچھ پتہ بھی نہیں تھا۔ زّٰهِدِیْنَ سے مُراد جان چھڑُانے والے ہیں۔ لفظ شَرَوْهُ سے مُراد بیچنا ہے۔ پہلے زمانے میں انسانوں کی منڈیاں لگتی تھیں۔ اُنہوں نے حضرت یوسفؑ سے کچھ نہ پوچھا اور نہ حضرت یوسفؑ نے کوئی شور مچایا، نہ بھائیوں کا رونا رویا۔ کیا ہم ایسے وقتوں میں واہ ویلا نہیں مچاتے۔

یہ چُپ کا صبر ہوتا ہے۔ اسے صبر جمیل کہتے ہیں۔ اپنے حالات کا شکوہ بھی نہ کرو۔ جتنے دُکھی ہو اُتنے خوش نظر آؤ۔ جتنے بھوکے ہو اُتنے فریش لگو۔ حضرت عیسیٰؑ کا ایک عمل تھا کہ وہ جب روزہ رکھتے تھے تو ہونٹوں پہ تیل لگا لیا کرتے تھے کہ کہیں میرے چہرے سے میرا روزہ دار ہونا معلوم نہ ہو جائے۔ یہ صبر جمیل ہے۔ ہمارے معاملات ذرا سے خراب ہوتے ہیں تو ہم لوگوں کو اور خراب کر کے بتاتے ہیں کہ پتہ چل جائے کہ ہم دُکھی ہیں۔ صبر جمیل یہ ہے کہ لوگ آپ کو ہر وقت ایک جیسا سمجھیں۔ آپ خوشیوں اور غموں میں ایک جیسے ہوں۔ خوشیوں میں وہی وقار اور متانت ہو جو عام حالات میں ہوتا ہے۔ عموماً انسان یہ نہیں کر پاتا۔ ہم اپنے آپ سے پوچھیں کیا میں اپنے جذبات چھُپاتی ہوں۔ جس طرح بچہ جب گرتا ہے تو اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ مجھے کسی نے دیکھا ہے، اگر تو کوئی دیکھ لے تو بچہ زور زور سے رونا شروع ہو جاتا ہے اور اگر کوئی نہ دیکھ رہا ہو تو خود ہی صحیح ہو جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح انسانوں کا معاملہ ہے کہ جب اُنکو ہمدردی ملتی ہے تو وہ زیادہ روتے ہیں۔ جو انسانوں کو بڑا سمجھتے ہیں وہ انسانوں کو سہارا بناتے ہیں اور وہ روتے بھی انسانوں کے لیے ہیں۔ یوسفؑ نے بڑا قیمتی سودا کیا ہوا تھا کہ میں نے لوگوں کو اپنے حالات نہیں بتانے۔ یہ انسان تھے دُکھ ہوا۔ نبیوں کی کہانیاں پڑھتے ہوئے یہ احساس تو ہو رہا ہے کہ یہ سب انسان تھے۔ انسانی جذبات بھی تھے۔ یہی بات آج کے نیک لوگوں کے لیے ہے وہ بھی انسان ہوتے ہیں۔ خوشی، غم، دُکھ سُکھ، گرمی سردی سب محسوس کرتے ہیں۔

دوسری صورت کیا تھی کہ جب کنوئیں سے نکلے تو شور مچا دیتے۔ آپ تصور کریں۔ جنھوں نے ان کو نکالا تھا اُن کو تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ کہتے اچھا چُپ کرو ابھی تمہارے باپ کو ڈھونڈتے ہیں، پولیس کو بتاتے ہیں۔ اتنے میں وہ قافلہ بھی پاس پہنچ جاتا۔ بات سب میں چلی جاتی۔ اب آگے کیا ہوتا کہ سب یوسفؑ سے کچھ نہ کچھ پوچھ کے اُن کو واپس اُن کے گھر چھوڑ آتے۔ گھر کنعان میں تھا اور کنعان ایک گاؤں تھا۔ سارا اناج مصر سے آتا تھا۔ تو بظاہر کیا ہوتا کہ یوسفؑ واپس جاتے۔ ساری بات باپ کو بتاتے، باپ بھائیوں کو پوچھتے، بھائیوں میں پھوٹ پڑ جاتی اور سال ہا سال بھائی آپس میں ناراض ہو جاتے۔ ہم عموماً یہی کچھ کرتے ہیں۔ باپ کو پتہ چل گیا تھا کہ بیٹا نہیں مرا۔ جہاں بھی رہے خیر سے رہے اور نبی کو یہ بھی یاد تھا کہ میرے بچے نے بہت اچھا خواب دیکھا ہوا ہے۔

اللہ کے وعدوں پہ یقین انسان کو سر اُٹھا کے جینا سکھاتا ہے۔ میرا بیٹا نہیں مرے گا جب تک رَب اُس کو چُن نہ لے۔ جو فراست والے لوگ ہوتے ہیں وہ اپنے اوپر آنے والے سخت حالات پہ خوش ہو رہے ہوتے ہیں کیوں کہ اُن کو پتہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد بڑی خیر نکلنی ہے اور ہم جیسے تھوڑے دل والے

شور مچاتے ہیں۔ یہاں سے ایک بڑا خوبصورت نقطہ ملتا ہے کہ بعض دفعہ کچھ لوگ بڑی محبتوں میں پلتے ہیں، کسی کی آنکھ کا تارا ہوتے ہیں، لیکن دوسرے ماحول میں جاتے ہیں تو لوگ اُن کی قدر نہیں پہچانتے۔

اس میں سب سے پہلی مثال محمد ﷺ کی ہے۔ مکہ میں پلے، بڑھے، کسی کو دُکھ نہیں دیا، ہمیشہ سب کے لیے خیر کا معاملہ کیا۔ جب حجرِ اسود کے موقع پہ جنگ ہو رہی تھی تو اُنکو روکا۔ حِلفُ الفضول میں حصہ لیا۔ اپنے ہاتھ سے مکہ میں سوشل ورک کرتے تھے لیکن مکہ والوں نے اُنکے معاملے میں جو نہی اللہ کے نبی نے اللہ کا کام کیا تو مکہ والے آپ سے جان چھڑانے لگے۔

سورۃ انفال میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں کہ انہیں مار دو، بستی سے نکال دو، یا قید میں ڈال دو۔ لیکن جب آپؐ مدینہ آئے تو حالات بدل گئے۔ اسی طرح کچھ بچیاں گھر والوں کی آنکھوں کا تارا ہوتی ہیں اور ایسے لوگوں میں چلی جاتی ہیں جو انکا مول کوڑیوں میں لگاتے ہیں۔ جس کا دل چاہے طعنہ دے دے، جس کا جو دل چاہے کہہ دے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج ہم نے اپنے بچوں کو خود مادہ پرست بنا دیا۔ کوئی بچہ پڑھنے کے لیے ماں باپ سے دور ہے، کوئی نوکری کے چکر میں اور کوئی شادی کے چکر میں ماں باپ سے دور ہے۔ یہ اسلام کا مزاج نہیں ہے۔

آج ہم مسلمان اگر اس بات کو سمجھ جائیں کہ اتنی ہی قربانیاں اگر ہم اللہ کے دین کے لیے اپنے بچوں سے دلوائیں تو پھر شاید آج ہمارا یہ حال نہ ہوتا۔ آج دین کی تعلیم کے لیے کتنے بچوں کو دوسرے شہروں یا دوسرے ملکوں میں بھیجتے ہیں۔

امام بخاری کا واقعہ آپ نے سُنا ہو گا کہ بچپن میں اُنکی ماں نے اُنہیں گھر سے نکال دیا تھا جاؤ دین سیکھ کے آؤ۔ امام ربیع کا واقعہ آپ نے سُنا ہو گا۔ اُس بچے کا واقعہ تو یاد ہو گا جس کی ماں نے قمیض کے اندر کچھ پیسے سی دیئے اور راستے میں ڈاکو پڑ گئے۔ پوچھا کچھ ہے کہا ہے، تلاشی لی کچھ نہ ملا۔ کہا قمیض میں سلائی کیئے ہوئے ہیں۔ کہا تم نہ بتاتے تو ہمیں نہ پتہ چلتا۔ بچے نے کہا کیوں نہ بتا تا میری ماں نے کہا تھا بیٹا جھوٹ نہ بولنا(کچھ روایات میں ہے کہ یہ عبد القادر جیلانیؒ کا واقعہ تھا)۔

آج ہم قرضوں میں ڈوبے ہوئے، دنیا کی محبت میں چُور نسلوں کو اس طرح کی قربانیوں میں لیتے ہیں تو پھر یوسف نام تو ہو سکتا ہے، کردار اللہ ہی بنائے گا تو بنے گا۔ کتنے سال کا یوسف ہے اور باپ نے اتنی اچھی تربیت کی ہے کہ اُن کے اندر اتنا صبر ہے۔ اب یوسفؑ کی زندگی کا ایک نیا روپ؛ وہ کیسے؟

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِن مِّصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۚ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ

﴿۲۱﴾ مصر کے جس شخص نے اسے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا "اِس کو اچھی طرح رکھنا، بعید نہیں کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنا لیں" اس طرح ہم نے یوسفؑ کے لیے اُس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ۔

یہ کون شخص تھا؟ قرآن نے اسے عزیزِ مصر کا ٹائٹل دیا ہے۔ عزیز ٹائٹل ہے۔ بڑے عُہدے والا بندہ تھا۔ مصر میں ایک وزیر کی حیثیت رکھتا تھا۔ بڑا صاحبِ ذیرک شخص تھا۔ حدیث میں آتا ہے دنیا میں صاحبِ فراست تین لوگ گزرے ہیں۔ فراست سے مُراد Genious ہے۔

یعنی جو لوگوں کا بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ایک عزیزِ مصر۔ جس نے اپنی بیوی کو یہ نصیحت کی تھی کہ یہ اچھے گھر کا بچہ لگتا ہے۔ اسے پیار سے رکھنا، نوکر نہ سمجھنا، اپنا بیٹا ہی بنالو۔ دوسرے حضرت ابو بکر صدیقؓ۔ کیوں کہ اُنہوں نے اپنے بعد حضرت عمرؓ کو متعین کیا تھا۔ اور تیسرے حضرت شعیبؑ کی بیٹی صفورہ۔ آگے سورۃ قصص اور سورۃ طٰہٰ میں اس کا قصہ پڑھیں گے۔ اس نے اپنے باپ کا مشورہ دیا تھا کہ موسیٰؑ کو نوکری دے دیں، اپنا ملازم رکھ لیں۔

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر کسی کو انسانوں کو پڑھنا نہیں آتا۔ ہم ظاہری حُسن سے انسان کو پرکھتے ہیں۔ ہمارا یہ خیال ہوتا ہے کہ خوبصورت بچے کا نصیب بھی بہت خوبصورت ہو گا۔ حالانکہ اللہ کے ہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ حضرت یوسفؑ باپ کی محبت سے کنوئیں میں اور کنوئیں سے اب بازارِ مصر میں نظر آتے ہیں۔ عزیزِ مصر کو حضرت یوسفؑ کے کردار نے، اس بات نے اس طرف مائل کیا کہ یہ اچھے گھر کا بچہ ہے۔ بعض بچوں کے چہروں سے پتا چل رہا ہوتا ہے کہ یہ بہت سمجھ دار ہیں۔ انسان کے نفس کا یہ بہت بڑا امتحان ہوتا ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات میں اللہ کی اطاعت پر قائم رہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اچھے دنوں کا انتظار عبادت کی بہترین شکل ہے۔ یہ حدیث کا خلاصہ ہے۔ مثلاً آپ بیمار ہیں، کوئی آپ کی خیریت پوچھتا ہے تو آپ کہتے ہیں میں ٹھیک ہوں، بس اب بالکل ٹھیک ہونے والی ہوں، ایک ڈاکٹر ملا ہے، انشاءاللہ جلدی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ اگر حالات اچھے نہیں تو کہیں بس نوکری ملنے والی ہے، بہت جلد حالات اچھے ہو جائیں گے۔ یہ عبادت ہے۔ اور اس کے اُلٹ، گلے، شکوے، بس کیا بتائیں پوری نہیں پڑتی، یہ بیماری، اِدھر درد اُدھر درد۔

یہ کرنے والے لوگ پھر لوگوں کے ہی ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ کی زندگی میں دن تھا پھر رات آگئی۔ شکوہ نہیں کیا۔ ہم تو ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ ہم پہ ذرا مشکل آئے پھر جو میاں کے سامنے دُکھڑے ہوتے ہیں، رونے ہوتے ہیں۔ یاد رکھیں جو خود کو چھوٹا سمجھتا ہے وہ اپنی آنے والی تکلیفوں کو بہت چھوٹا سمجھتا ہے۔ آپ جتنے اندر سے ٹوٹے ہوئے ہوں گے اُتنی عاجزی آئے گی اور جو اندر سے جتنا اکڑا ہوا، پھولا ہوا ہوتا ہے، اگر اُنگلی پہ کٹ بھی آ جائے تو کہتا ہے میرے پہ آج کل بڑی آزمائشیں آ رہی ہیں۔ میری کام والی چلی گئی، میں تو آزمائش میں پڑ گئی۔ یہ اندر کا موٹا پن ہوتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کوئی بڑا ہوا اور گرا نہ ہو۔ گر گر کے لوگ بڑے بنتے ہیں۔ صرف ایک ذات ہے جس کو فنا نہیں۔ سبق یہ سیکھنا ہے کہ یہ مشکل کیوں آئی، میرا اس میں کیا گناہ تھا اور اب میں اس سے کیسے نکلوں کہ یہ تکلیف مجھ سے چلی جائے۔ جس نے اپنی تکلیف سے یہ سیکھ لیا اُس کے لیئے وہ تکلیف اُس کی اُستاد بن جاتی ہے۔

مصیبت، دُکھ، بیماری، پریشانی، الزام کچھ بھی لے لیجیۓ، مصیبت بندے کی اُستاد بن جاتی ہے۔ شرط ایک ہے کہ آپ اُس سے نصیحت لیں۔ حدیث کا خلاصہ ہے کہ منافق کا حال اُس گدھے کا ہے جسکو پتا ہی نہیں کہ میرے مالک نے مجھ سے ناراض ہو کے مجھ پہ وزن ڈالا ہے یا خوش ہو کر۔

یہ نفاق ہے کہ انسان کو اپنے اوپر آنے والی تکلیفوں کی وجہ ہی نہ سمجھ آئے۔ بیماریوں اور دُکھوں کو وہ اسباب کا ہی نام دیتا رہے، موسم بدل رہا ہے تو یہ ہو گیا، گرمی ہو گئی تو یہ ہو گیا، جبکہ مومن اس کو اپنے گناہوں کی سزا سمجھتا ہے۔ اب بظاہر یہ لگ رہا ہے کہ یوسفؑ کے ساتھ زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ آئندہ روشن مستقبل کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اگر صحرا میں حاسد بھائیوں کے ساتھ ہی رہتے تو وہ کبھی

نہ ملتا جواب ملنے والا ہے۔ آزمائش کے بغیر اگر انسان کو کوئی چیز مل جائے تو انسان اُسکا بوجھ ہی نہیں اُٹھا سکتا۔

بالکل ایسے کہ جیسے کچے برتن کو ڈھالنے کے لیے پہلے بھٹی میں ڈالنا پڑتا ہے۔ تو بڑا بننے کے لیے آزمائشوں کی بھٹی سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب عزیزِ مصر پہ آجائیں۔ یہاں مصر Ejypt کے معنی میں ہے۔ مصر عربی زبان میں 'شہر' کو کہتے ہیں۔

اس کا نام کیا تھا؟ کچھ کہتے ہیں ریان بن ولید اُس دور میں مصر کا حکمران تھا اور یہ اُسکا وزیرِ خزانہ تھا۔ اِمْرَاَتِهٖ کا نام کیا تھا؟ قرآن نے اسکو کچھ نہیں کہا۔ ہمارے کلچر نے اسکو ذلیخا کہا۔ کچھ نے اسکو رائیل بھی کہا۔ ہمیں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پھر کیا کہا کہ تم اسکو عزت سے رکھو اور اچھا ٹھکانہ دینا۔ یہ لفظ مَثْوٰىهُ یعنی دراز مدت تک رہنے کا مقام۔ تم اس سے اچھا کرنا تاکہ یہ بھی تم سے اچھا کرے۔ اور جب بیٹے کی بات کہ تو لگتا ہے کہ وہ اُس وقت تک اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ یوسف کے لیے اللہ نے راستے ہموار کر دیئے۔ فِي الْاَرْضِ سے مُراد مصر ہے۔ باپ کی تربیت سے نکال کے عزیزِ مصر کی تربیت میں میں ڈالا۔ پہلے صحرا میں بکریاں چراتے تھے۔ فطرت کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ اب اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر گئے۔

اُس دور کے کچھ حالات بھی سمجھ لیں۔ ہم اپنے بچوں کو پہلے اپنے ملکوں میں پڑھاتے ہیں پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجتے ہیں۔ باہر بھیجنے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں۔ پیپر ورک، ویزا اور کیا کیا مراحل طے کرتے ہیں۔ جب بچے باہر چلے جاتے ہیں تو اُن کی تعلیم پہ لاکھوں خرچ ہو جاتا ہے۔ طویل جدائی کاٹتے ہیں۔ اگر یہی ہم اُنکو باہر بھیجنے سے پہلے ویسی تربیت کر چکے ہوں جیسی حضرت یعقوبؑ نے

حضرت یوسفؑ کی کی تھی تو اس سے زیادہ کوئی نفع کا سودا نہیں ہے۔ اور آج کے دور میں ماؤں کو یہی کرنا چاہیئے۔ اپنے بچوں کو خوب اچھا پڑھائیں، اُنکے دلوں میں اللہ کی محبت ڈالیں، ٹین ایج تک اُنکو پوری شریعت کا ایک خوبصورت نمونہ بنا دیں، پھر آپ اُنہیں دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں بھیج دیں۔ آپ کے بچے وہ بیج بنیں گے جو اُن ملکوں اور اُن شہروں میں اسلام کے پودے لگائیں گے۔ یہ احسن درجہ ہے۔ پھر تو آپ جُدائی کاٹیں، اللہ آپکو بہترین درجہ دے گا۔ پھر آپ کے بچوں کی دنیا بھی بنیں گی اور آخرت بھی بنیں گی۔

لیکن اگر یہ کیے بغیر کورے کاغذ کی طرح بچے کو اُس ماحول میں ڈال دیا جہاں کا رنگ بڑی جلدی چڑھتا ہے تو چند سال بعد آپ اُسکا اپنا رنگ بھی نہیں پہچان سکیں گے۔ حضرت یعقوبؑ تو ایک چرواہے تھے وہ یہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے کہ اپنے پیارے بیٹے کو پڑھنے کے لیئے مصر بھیجیں، تو اللہ نے راستے بنا دیئے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے تھے کہ یوسفؑ سے وہ کام لیں جو ابھی تک بنی اسرائیل سے نہیں لیا تھا۔ کیوں کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل غلامیوں میں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا۔ آنے والے ماحول کے لیئے ضروری تھا کہ وہاں کے ماحول کو سمجھیں۔ اُس دور میں ہوسٹلز تو ہوتے نہیں تھے۔ اللہ نے کیا انتظام کیا کہ عزیزِ مصر کے گھر میں رکھ دیا۔

اگر یعقوبؑ یوسفؑ کو لے کے عزیزِ مصر کے پاس آتے کہ میرے بچے کو رکھ لیں تا کہ اس کی اچھی تربیت ہو جائے تو وہ کبھی بھی نہ مانتا۔ لیکن بعض اوقات ہم ایک چیز چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُس کے ایسے سبب بنا دیتا ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔

اپنے لیئے عمل کی بات لکھیئے، جب اللہ سے کچھ مانگیں تو اس تک پہنچنے کی آسانی بھی مانگیں۔

ایسا نہ ہو کہ جو چیز آپ نے مانگی اُس کا سفر اتنا بوجھل، اتنا گراں ہو جائے کہ ہم برداشت ہی نہ کر سکیں۔ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ۔ یہاں اس پر بھی غور کیجیئے کہ ایک بچہ جو اغوا ہو چکا ہے، باپ سے دور، غلام بن چکا، چند ٹکوں میں بِک چکا، گھر سے بے گھر ہو چُکا لیکن اللہ تعالیٰ کیا کہتے ہیں مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ۔ اللہ تعالیٰ اُسکو ایک اور ہی اینگل سے دیکھ رہے ہیں۔

یہ فرق ہوتا ہے اللہ کی نظر میں اور ہماری نظر میں۔ ہم جس چیز کو اپنے حق میں بُرا سمجھتے ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ اُسے اچھا سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یوسفؑ کو ایسی جگہ دی جو تربیت کی جگہ تھی۔ بہترین تربیت، مصر کی حکومت تک پہنچنے کا راستہ ہموار ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ خود وہاں تک لے آئے۔ عزت سے وہاں رکھا۔ یہ خوبصورت بات کر کے اللہ تعالیٰ نے مصر تک پہنچنے کا راستہ درست کر دیا۔